محمد بلال

حیات امین احسن

(۲۳)

باب ۱۷

نام ور شخصیات: امین احسن کی نظر میں

امین احسن نے اپنی تحریروں اور گفتگوؤں میں رسمی اور غیر رسمی انداز میں مختلف نام ور شخصیات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس سے بھی امین احسن کی شخصیت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ ذکر رسمی اور غیر رسمی، دونوں اسالیب میں ہوا، اس لیے بعض شخصیات کا ذکر باقاعدہ اور تفصیلی اور بعض شخصیات کا ذکر مختصر اور سرسری سا ہے۔ اس سرسری بیان سے بھی امین احسن کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ امین احسن کا برصغیر پاک وہند کی بڑی بڑی شخصیات کے ساتھ ملنا جلنا رہا، اس لیے ان شخصیات کے بارے میں ان کی آرا تاریخی اہمیت بھی رکھتی ہیں۔

سقراط

کتاب ''سقراط'' کے مصنف ڈاکٹر منصور الحمید لکھتے ہیں:

''۱۹۹۶ء کی گرمیوں میں دمام (سعودی عرب) سے پاکستان گیا تو میں نے اپنی کتاب ''سقراط'' مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کی۔ مولانا ان دنوں اپنی بیماری کے باعث پڑھنے سے تقریباً معذور تھے اور بمشکل چند

صفحات الٹ پلٹ لیتے تھے لیکن سقراط کی شخصیت سے دلچسپی کی بناء پر انھوں نے میری کتاب کے پچاس ساٹھ صفحات تک پڑھ ڈالے۔ اس موقع پر میں برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ تین چار نشستوں میں مولاناؒ کی گفتگو کا موضوع سقراط ہی رہا۔ میں نے یہ گفتگو اس وقت ریکارڈ کر لی اور اسے مرتب کر کے مضمون کی صورت میں ارسال کر رہا ہوں۔ یہ حتی الامکان مولانا مرحوم کے الفاظ ہی میں ہے:

”مجھے جس طرح قرآن مجید سے دل چسپی ہے، ایک زمانے میں اسی طرح سقراط سے بھی دل چسپی رہی ہے۔ گو میں نے دیگر فلاسفہ کو بھی پڑھا ہے لیکن سقراط کو نہایت غور سے اور حرف بحرف پڑھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی باتیں عقل و فطرت کے مطابق ہیں۔ وہ انسانی ذہن کے تقاضوں کے مطابق بات کرتا ہے۔ قدیم یونانی حکماء میں سے ارسطو نہایت پڑھا لکھا آدمی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ براہ راست انسانی فطرت سے اسے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ارسطو میں اپنے ذوق کی غذا نہیں ملی جبکہ سقراط کی باتیں مجھے فطرت کے قریب محسوس ہوتی ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ وہ مصنوعی طور پر پڑھا لکھا نہیں تھا۔

میری دل چسپی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان الجھنوں کو جو میرے ذہن میں ہوتی تھیں، ایک نہایت حکیمانہ سوال کی شکل میں سامنے لے آتا تھا۔ اگرچہ اس کے جو جوابات نقل ہوئے ہیں مجھے اس میں کمیاں محسوس ہوتی ہیں لیکن مجھے اس کے جوابات سے کم اور اس کے سوالات سے زیادہ دل چسپی رہی ہے۔ پھر وہ جس طرح جرح کر کے انسانی ذہن کو اضطراب میں ڈال دیتا ہے، یہاں تک انسان غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ بات قرآن مجید کے عین مطابق ہے قرآن مجید بھی انسان کی غور و فکر کی صلاحیتوں ہی کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ سقراط کو پڑھنا، میرے لیے قرآن مجید سمجھنے میں بھی مدد و معاون ثابت ہوا ہے۔

فلسفہ کی تاریخ میں بیشتر فلاسفہ ناقل ہیں۔ جو کچھ پہلے کہا گیا اسی کو تھوڑا سا بدل کر ذرا مختلف انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ سقراط میں یہ خوبی ہے کہ وہ خلاق بھی ہے اور موجد بھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر فلاسفہ انسانی فطرت سے براہ راست تعرض نہیں کرتے جبکہ سقراط میں خاص بات یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کو براہ راست چھیڑتا ہے۔ پے در پے سوالات سے ہمارے اندر کی الجھنوں کو اتنا واضح کر دیتا ہے کہ انسان خود سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ فلاسفہ معاشرہ سے ڈرتے بلکہ معاشرہ کے اسیر ہوتے ہیں۔ سقراط نہ معاشرہ سے ڈرتا ہے نہ معاشرہ کا اسیر ہے۔ اس کی زندگی کسی بادشاہ یا حکومت سے وابستہ نہیں رہی۔ اس کا سب سے الگ اپنا ہی ایک دائرہ ہے جس میں اسی جیسے کچھ لوگ ہیں۔ اس لیے وہ محض مفکر ہی نہیں ایک لیڈر بھی ہے۔

سقراط کی زندگی بے عیب ہے، اس کا اخلاق نہایت پاکیزہ ہے، علم اس کی باتوں سے برستا ہے، اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ نبی رہا ہو۔ انبیاء جتنے بھی ہیں وہ سب کے سب قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں۔ سقراط میں

وہ اوصاف پائے جاتے ہیں جو انبیاء میں ہوتے ہیں۔ انبیاء کا علم انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ براہ راست ہے۔ یہی حال سقراط کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سقراط کو پڑھنے کے ابتدائی دور ہی میں میری یہ رائے تھی کہ نبی ہونے کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہیں پھر جس زمانے اور جس ملک میں وہ پیدا ہوا اس میں اسی طرح کا آدمی نبی ہو سکتا تھا۔

تاریخ کی کسی قدیم شخصیت کو نبی ماننا یا نہ ماننا خدا کو ماننے یا نہ ماننے کے مترادف نہیں ہے۔ یہ کوئی عقیدے اور ایمان کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ نبی پر خدا کی وحی آتی ہے اور میرا خیال ہے کہ سقراط کے ضمن میں اس کے شواہد پائے جاتے ہیں۔ کم سے کم اتنی بات تو طے ہے کہ سقراط بہر حال ہے پڑھے جانے کی چیز۔ اس کے پاس علم بھی ہے، اخلاق بھی ہے اور کردار بھی۔ دنیا کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ ان کے بارے میں کچھ لکھنا اور شائع کرنا درحقیقت دنیا پر احسان کرنا ہے۔'' (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۴۴)

اسی موضوع پر ڈاکٹر زاہد منیر عامر امین احسن کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کی تفصیل بتاتے ہیں:

''بات سوفسطائیہ سے چل کر مولانا اصلاحی کے استاد گرامی اور سقراط پر آپہنچی ہے اس روز مولانا اصلاحی سے گفتگو میں بھی یہی ہوا، البتہ پہلے سقراط پر بات ہوئی اور پھر مولانا فراہی پر۔

مولانا نے یونانی فلسفے کی تاریخ کے حوالے سے فرمایا کہ آغاز کے تین فلسفیوں کو چھوڑ کر باقی سب فلسفی یونہی ہیں۔ یہ تین فلاسفر سقراط، افلاطون اور ارسطو ہیں۔ ان میں بھی سقراط اصل فلسفی ہے، باقی دونوں اس کے سلسلے سے وابستہ ہیں اور تینوں کے خیالات اسلام سے کامل مطابقت رکھتے ہیں۔ مجھے اس بات سے تعجب ہوا لیکن بعد ازاں سقراط سے متعلق اکثر ماخذ سے یہ معلوم ہوا مثلاً ول ڈیوراں (Will Durant) نے The Story of Philosophy میں بتایا ہے کہ سقراط نہ صرف توحید پرست تھا بلکہ حیات بعد الموت کے عقیدے پر بھی ایمان رکھتا تھا۔ چند برس قبل ''سقراط'' کے عنوان سے منصور الحمید صاحب کی کتاب منظر عام پر آئی تو اس میں یہ بحث اور زیادہ وضاحت سے ابھری، یہ کتاب بہت محنت اور سلیقے سے لکھی گئی ہے۔ اگرچہ اس میں بات کچھ بڑھ گئی ہے۔

سقراط کی توحید پرستی کی حد تک تو بات قابل تسلیم ہے لیکن افلاطون اور ارسطو کے حوالے سے اسلامی تعلیمات سے کامل مطابقت کی بات زیادہ قابل فہم نہیں تھی۔ اگرچہ افلاطون اور ارسطو بھی ذات باری تعالیٰ پر تو یقین رکھتے ہیں لیکن ان کے بعض افکار اسلامی تعلیمات سے ''کامل مطابقت'' نہیں رکھتے۔

بہر حال یہ بات اطمینان بخش ہے کہ ۱۹۹۱ میں جب ''فلسفے کے بنیادی مسائل'' سے متعلق مولانا کی

کتاب شائع ہوئی تو اس میں نہ صرف یہ کہ افلاطون اور ارسطو کے افکار کو اسلامی تعلیمات کے مطابق قرار نہیں دیا گیا بلکہ مولانا نے ”افلاطون کے فلسفہ کی غلطی اور ”ارسطو کے فلسفہ کی خامی“ کی نشان دہی بھی کی۔

مولانا اصلاحی اپنی زندگی میں جس شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ ان کے استاد گرامی مولانا حمید الدین فراہی کی شخصیت تھی۔ انہوں نے اپنے استاد گرامی کے طریقۂ تعلیم کو ”سقراطی طریقۂ تعلیم“ قرار دیا ہے۔ مولانا کے نزدیک ”سقراطی طریقۂ تعلیم“ کیا ہے اس کی وضاحت انہوں نے اپنے ایک ریڈیو انٹرویو میں کی تھی:

”مولانا کا طریقۂ تعلیم ایسا نہیں تھا کہ پکا پکایا سامنے رکھ دیا جائے۔ درحقیقت وہ طالب علم کی استعداد اور ذہانت کو بیدار کرتے تھے۔ اس کے اندر سوالات پیدا کرتے تھے۔ اگر وہ مسائل پر غور کرنے کی صلاحیت ظاہر کرتا تو وہ کچھ رہنمائی دیتے تھے ورنہ خاموش ہو جاتے۔ یہ ”سقراطی طریقۂ تعلیم ہے۔““

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۶۱)

مارکس آریلیئس (Marcus Aurelius)

عبدالرزاق صاحب اپنی ۲۸ر جنوری ۱۹۹۴ء کی ڈائری میں فلسفی مارکس آریلیئس کے حوالے سے امین احسن کی رائے بیان کرتے ہیں:

”مولانا نے خاص طور پر مارکس آریلیئس کا نام لیا اور کہا کہ میں فلسفہ میں اس کا مرید ہوں۔ اس فلسفی سے مولانا بڑے متاثر نظر آرہے تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو نصیحت کی کہ اگر وہ اپنے آپ کو پہچاننا اور زندگی کی حقیقت کو جاننا چاہتے ہیں تو وہ مختلف حکماء اور فلسفیوں کی کتابوں کو ضرور پڑھیں ان کو پڑھنے کے بعد آپ کو پتہ چلے گا کہ جس فلسفی کو حقیقت کا ادراک ہو گیا اس کو سب کچھ مل گیا۔ وہ روم اور ایران کی بادشاہی کو اپنے قدموں تلے کچل دیتا ہے۔ اس میں اتنی ہمت ہوتی ہے کہ وہ بادشاہ کی کسی غلطی پر اسے پورے دربار کے سامنے ڈانٹ پلا دیتا ہے۔ ایسا شخص بادشاہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔“

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۷)

ڈارون

ڈاکٹر زاہد منیر عامر کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے امین احسن نے مسئلۂ ارتقا اور ڈارون کے بارے میں کہا:

”کائنات ارتقاء ہی کے ذریعے سے وجود پذیر ہوئی ہے۔ ارتقاء بجائے خود صحیح ہے لیکن ڈارون کی توجیہ

غلط ہے۔

انسان پہلے کیچڑ ہی میں تھا۔ایک خاص فارم سے اس نے ترقی کی، ارتقاء ہوتے ہوتے وہ اس فارم میں آیا کہ وہ ایک انسان بن سکے۔ اللہ نے ارادہ کیا اور اس چیز (فارم) سے آدم وجود میں آئے اور ان کا جوڑا پیدا کیا گیا۔ سائنس والے مانتے ہیں کہ حقیقت میں ایک ہی چیز تھی جس میں نر اور مادہ دونوں کے جراثیم موجود تھے۔ لیکن یہ سب ایک مدبر، حکیم اور خبیر نے کیا... آخر اس کی کیا توجیہ ہے کہ کیونکر ایک چیز بنتی چلی گئی۔ آپ سے آپ تو کچھ بھی نہیں ہوتا، ایک درخت کی شاخ بھی ایک خاص سکیم کے تحت ظاہر ہوتی ہے۔ڈارون کی تقریر پر ہمیں اعتراض ہے اس میں جگہ جگہ معقولیت نہیں ہے۔ (تاہم) جب ارتقائے آدم ہو گیا اور جب آدم وجود میں آ گئے تو نسل انسانی وجود پذیر ہو گئی۔ اب وہ پہلا دور ختم ہو گیا۔ ایک فٹسٹ (Fittest) جب وجود میں آ جائے تو دوسری چیز اس میں مداخلت نہیں کرتی Survival of the Fittest (بقائے اصلح) کا یہی مطلب ہے کہ جب ایک Fittest وجود میں آ جائے اپنے راستے پر چلے گا۔

ہم ارتقاء کے اصول کے بقائے اصلح Survival of the Fittest کے قائل ہیں۔ یہ اصول ہے لیکن ڈارون کی توجیہ نہایت احمقانہ ہے۔ وہ ایک مصنف ہے ایک تقریر کرنے والا ہے اسے زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔'' (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۶۶)

علامہ اقبال، حالی اور فارابی

اپریل ۱۹۳۸ء میں ''بلبلِ نالاں'' کی روح ''اجڑے گلستان'' سے پرواز کر گئی۔ اس المیہ نے امین احسن کو بے حد متاثر کیا۔ انھوں نے اس پر کچھ اس انداز سے لکھا کہ مولانا الطاف حسین حالی کے بارے میں بھی ان کے خیالات سے آگاہی حاصل ہو گئی:

''یہ دور ہمارے عروج و اقبال کا دور نہیں، بد بختی و ادبار کا دور ہے۔ ہم پاتے کم ہیں کھوتے زیادہ ہیں۔ اونچے درجے کے اشخاص ہم میں اولاً تو پیدا نہیں ہوتے اور اگر دو چار پیدا ہوتے ہیں تو قبل اس کے کہ ان کے جانشین پیدا ہوں، وہ اپنی جگہ خالی چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ اپنی قوم کے ان لوگوں کو گنیے جن کے دم سے آج ہماری آبرو قائم ہے اور پھر دیکھیے کہ ایک ایک کر کے ان کی صف کس طرح ٹوٹتی جا رہی ہے اور کوئی نہیں جو ان کی جگہ لینے کے لیے آگے بڑھے۔ قوموں کے مرنے اور جینے کا ایک اصول ہے جو ہمارے موجودہ فلسفۂ قلت و کثرت سے بالکل مختلف ہے۔ ہم صرف سروں کو گننے کے عادی ہو رہے ہیں حالانکہ زندگی سروں

سے نہیں بلکہ دماغوں سے زیادہ دلوں سے ہے۔

غالباً ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے۔ استاد مرحوم مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، طلبہ کی مجلس میں اقبال کا شکوہ پڑھ رہے تھے۔ میں اس مجلس میں موجود تھا۔ یہ پہلی مجلس ہے جس میں میں نے شعر کے اثر کو آنکھوں سے دیکھا۔ آنکھوں سے اس لیے کہ اس وقت تک میرے دماغ میں شعر کی خوبیوں اور نزاکتوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ میں مجلس میں بیٹھا ہوا صاف سن رہا تھا کہ اقبال کے شعروں کی صدائے بازگشت در و دیوار سے بلند ہو رہی ہے اور آنکھوں سے علانیہ مشاہدہ کر رہا تھا کہ آسمان سے کوئی چیز برس رہی ہے اور ساری زمین ہل رہی ہے۔ میں نے آج تک کوئی مجلس اتنی پُراثر نہیں دیکھی اور اس ایک مرتبہ کے علاوہ شاید کبھی میرے دل نے شاعر بننے کی آرزو نہیں کی، لیکن یہ آرزو پوری نہیں ہوئی کیونکہ میں نے اقبال بننے کی آرزو کی تھی اور اقبال صرف ایک ہی ہوتا ہے...

شاید وکٹر ہیوگو نے کہا ہے۔ زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم الشان ہو لیکن تاریخ اپنے فیصلہ کے لیے ہمیشہ موت کا انتظار کرتی ہے۔ دنیا کے لیے ممکن ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہو۔ لیکن اقبال کے لیے تاریخ نے اپنے اس کلیہ کو توڑ دیا۔ اقبال کی عظمت کی گواہی دلوں نے ان کی زندگی میں دے دی، اب تاریخ کے لیے صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ وہ دلوں کے تاثرات کو محفوظ اور قلم بند کر لے...

مولانا حالی کی زبان بھی تیغ وسناں سے کم نہ تھی، ان کا تیشہ بھی ہمارے عمل واعتقاد کے ہر گوشہ کے لیے بے امان تھا۔ وقت کی سوسائٹی جن عناصر سے مرکب تھی ان میں سے ایک ایک کو چن کر حالی نے پکڑا اور قوم کی عدالت میں مجرم ٹھیرا کر ان کو بے دریغ سزا دے دی اپنی بے پناہ قوت سے ہمارے تمام اعمال ومعتقدات کو ایک نئی راہ پر لگا دیا۔ لیکن حالی کا کام آسان تھا۔ وہ قوم کو زمانہ کے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کو

اور زمانہ اپنی تمام رعنائیوں اور دلربائیوں کے ساتھ ان کی رفاقت کے لیے آمادہ کار ہو چکا تھا۔ ان کو جو دیواریں ڈھانی تھیں وہ خود متزلزل ہو چکی تھیں اور جو عمارت بنانی تھی اس کے لیے دستِ غیب خود چونہ اور گارا مہیا کر رہا تھا۔ وہ خزاں کی بلبل ضرور تھے مگر موسم گل کی آمد آمد ان کو شہ بھی دے رہی تھی...

اگر اقبال نہ پیدا ہوتے تو یقیناً ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم ہمارے نوجوانوں کو اس طرح مسخ کر ڈالتی کہ ان کے اندر دین وملت کے لیے حمیت وغیرت کا کوئی شائبہ باقی نہ رہ جاتا، وہ جس طرح ظاہر میں مسخ ہو گئے ہیں اس سے زیادہ ان کا باطن مسخ ہو جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اقبال کو بھیجا جو معلوم نہیں کس طرح

ظلمات کے ان تو بر تو پردوں کو چاک کر کے ان کے دلوں میں بیٹھ گئے اور جب تک ان کی روحِ شعر اس کائنات کے اندر کار فرما ہے اس قوت تک ان شاءاللہ ان میں درد کی ایک کسک باقی رہے گی، اگرچہ دلوں کی جگہ سینوں میں پتھر پیدا ہونے لگیں۔ماہنامہ الاصلاح، اعظم گڑھ، مئی ۱۹۳۸ء۔‘‘(مقالات اصلاحی ۴۰۲/۲-۴۰۶)

۸/جون ۱۹۹۰ء کی بات ہے۔امین احسن نے اپنی ہفتہ وار نشست میں اقبال پر بات کرتے ہوئے کہا:

’’اقبال بہت بڑے شاعر ہیں، بہت اچھے شاعر ہیں۔انھوں نے شاعری کو عالمگیر بنادیا۔ان کی شاعری کی زد سے کوئی چیز نہیں بچتی۔ جہاں چاہے چلے جائیں۔ اس بات نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس لیے کہ شاعری کا ایک محدود مفہوم تھا۔ کوئی یار ہو، کوئی زلف ہو، سروقد ہو، کچھ ہجر ہو، کچھ اس طرح کی چیزیں۔اقبال نے تو پورا جہان ہی بنادیا۔ ہر چیز ان کے دائرے میں ہے۔ ہر جگہ نشانہ لگاتے ہیں۔ اور یہ ہے کہ شاعری کا معیار گرنے نہیں پاتا۔دوسرے یہ کہ ان کے اندر بڑائی ایک اور بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ شعر میں کچھ نہیں ہوتا، لیکن شکوئی الفاظ سے شعر ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض شعر بالکل غلط اور بے معنی۔ لیکن وہ شکوئی الفاظ میں شعر بن گیا۔‘‘

ایک مرتبہ امین احسن سے یہ سوال دریافت کیا گیا کہ علامہ اقبال نے وحی کی نفی کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ وحی ایک وجدانی کیفیت ہوتی ہے، جب کہ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ وحی فرشتوں کے ذریعے نازل ہوتی ہے۔ وضاحت فرمائیں۔

امین احسن نے اس کا جواب کچھ اس انداز سے دیا کہ فارابی اور دیگر مسلم فلسفیوں کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر واضح ہو گیا۔ علامہ اقبال کا کلام، جب کبھی مجھے فرصت ہوتی ہے، میں پڑھتا ہوں۔ جہاں تک میں ان سے واقف ہوں مجھے ان کی باتیں معقول معلوم ہوتی ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں دین اور حکمت کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کلام میں مجھے کہیں ایسی فضول بات نظر نہیں آئی، جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے۔ باقی رہ گئے ان کے خطبات تو ان میں انہوں نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جو میرے نزدیک قابل اعتراض ہیں لیکن ان میں بھی یہ بات میں نے نہیں پڑھی۔ ہو سکتا ہے کسی نے غلط روایت کر دی ہو یا کہیں علامہ صاحب نے فلاسفہ کا کوئی خیال نقل کیا ہو اور وہ خود ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو۔

آپ نے جو خیال نقل کیا ہے یہ فارابی نے پیش کیا ہے۔ فارابی کے نزدیک وحی اندر کی کیفیات کا ایک بخار ہوتا ہے۔ میں فارابی کو لغو قسم کا آدمی سمجھتا ہوں۔ فارابی اور اس طرح کے دوسرے فلسفی صرف فلسفۂ یونان کے ناقل تھے۔ یہ قابل ذکر لوگ نہیں ہیں۔ یہ اسلامی فلسفہ کو تو کیا سمجھتے، یونانی فلسفہ کے بھی وہ کچھ غلط ناقل

ہی ہیں۔ یہی حال ہمارے متکلمین کا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں فلسفہ کی بحثوں میں ان نام نہاد اسلامی فلاسفہ کا حوالہ نہیں دیا کرتا۔‘‘(سہ ماہی تدبر، فروری ۱۹۸۹ء، ص ۴۵)

مولانا محمد علی جوہر

امین احسن مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ماہنامہ ’’میثاق‘‘ میں ’’مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ، مدرسۃ الاصلاح میں‘‘ کے زیر عنوان خود لکھتے ہیں:

’’فاضل محترم مولانا رئیس احمد جعفری نے مجھ سے فرمایش کی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق میں چند تاثرات قلم بند کر دوں۔ میں اس فرمایش کی تعمیل کے لیے آمادہ تو ہو گیا ہوں لیکن یہ بات مضمون کے پہلے مرحلہ ہی میں واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے مولانا سے صرف نسبت غائبانہ عقیدت ہی کی حاصل ہے، ان سے ملنے جلنے کے مواقع تو درکنار ان کو دور دور سے دیکھ لینے کی سعادت بھی شاید دو تین بار سے زیادہ مجھے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ تحریک خلافت کے شباب کے زمانے میں، سن ٹھیک طرح یاد نہیں (غالباً ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں) مولانا مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی بھارت) کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ میں اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں آخری درجوں کا طالب علم تھا۔ اس جلسہ میں مجھے یاد ہے کہ مولانا کا نام سن کر مدرسہ کے وسیع میدان میں بے پناہ خلقت جمع ہوئی۔ مولانا کے ساتھ وقت کے بعض دوسرے اکابر و مشاہیر بھی تشریف لائے، میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی کسی جلسہ میں کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے، لیکن اس جلسہ میں وہ بھی شریک ہوئے۔

بڑا عظیم اجتماع تھا، میں نے اس سے پہلے اس سے بڑا اجتماع کوئی نہیں دیکھا تھا، جلسہ کھلے میدان میں تھا۔ ہوا نہایت تند چل رہی تھی۔ اس زمانہ تک لاؤڈ سپیکر کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے اندیشہ تھا کہ مولانا کی تقریر سنی نہ جا سکے گی جس سے جلسہ میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ لیکن جب مولانا تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کے رعب و دبدبہ نے ہر شخص کو اس طرح مرعوب و مسحور کر لیا کہ جو شخص جس جگہ کھڑا یا بیٹھا تھا وہیں پیکر تصویر بن کر رہ گیا... مولانا کی بلند اور پر شکوہ آواز کی تندی اور مجمع کی غیر معمولی وسعت کے باوجود ہر گوشہ میں پہنچنے لگی۔ اور تقریر کے اثر کا عالم یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو رو نہ رہی ہو۔ یہ مجمع بالکل دیہاتیوں کا تھا۔ اس میں پڑھے لکھے لوگ بہت تھوڑے سے تھے، ان دیہاتیوں کے لیے مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ جیسے شخص کی کسی تقریر کو سمجھنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ لیکن

ان کی تقریر میں ایمان ویقین کی ایسی گرمی اور سوز ودرد کی ایسی گھلاوٹ تھی کہ اس سے متاثر ہونے کے لیے شاید اس کو زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس موقع کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے، جو قابل ذکر ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر جب ختم ہو گئی تو ہم نے دیکھا کہ مجمع کے ایک کنارے سے ایک بوڑھا دیہاتی اٹھا اور مجمع کو چیرتا پھاڑتا سیدھا اسٹیج کی طرف چلا۔ اگرچہ اسٹیج تک پہنچنے میں اس کو سخت مزاحمتوں سے سابقہ پیش آیا لیکن وہ اپنی دھن کا ایسا پکا نکلا کہ اس نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا۔ اور پہنچتے ہی ان کی ڈاڑھی پر ہاتھ رکھ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا کہ:

''محمد علی جو تو نے کیا وہ کسی سے نہ ہو سکا۔'' یہ کہہ کر جب وہ واپس مڑا تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''اس طرح کی داد بھی آپ کے سوا مجھے کسی اور سے نہیں ملی۔''

اس موقع پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا ایک اور پہلو میرے سامنے اپنے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے تاثرات سے واضح ہوا۔ اس جلسہ میں تقریر کر کے، مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اعظم گڑھ شہر کے لیے روانہ ہو گئے جہاں شب میں ان کو ایک جلسۂ عام میں تقریر کرنی تھی، وہ گئے تو ان کے ساتھ 'مدرسۃ الاصلاح' کا سارا جلسہ بھی چلا گیا یہاں تک کہ خود مولانا فراہی بھی جو مدرسہ کے ناظم تھے ان کی تقریر میں شرکت کے لیے ان کے ساتھ چلے گئے۔ انھوں نے چلتے وقت ہمیں یہ ہدایت کی کہ کچھ کٹے ہوئے کاغذ اور چند اچھی پنسلیں ان کے سامان میں رکھ دی جائیں تاکہ وہ اعظم گڑھ میں ہونے والی مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر نوٹ کر سکیں۔ یہ معاملہ میرے لیے نہایت حیرت انگیز تھا، میں اس بات سے تو واقف تھا کہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے محبت کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کی تقریر سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا اس درجہ میں متاثر ہونا کہ وہ خود اس کے نوٹ کرنے کا اہتمام کریں میرے تصور سے مافوق تھا۔ مولانا نہ تو جذباتی آدمی تھے نہ کوئی سیاسی آدمی۔ وہ ایک محقق ایک فلسفی اور ایک حکیم تھے، وہ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا وعظ و تقریر کے جلسوں میں خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے لیکن مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر میں شریک ہونے کے لیے نہ صرف یہ کہ سفر کے لیے آمادہ ہو گئے بلکہ ان کی تقریر کے نوٹ لینے کے لیے یہ اہتمام فرمایا۔ مولانا کے اس اہتمام نے میرے دل میں مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت بہت بڑھا دی۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی ایک عظیم سیاسی لیڈر ہی نہیں بلکہ وہ علمی و عقلی اعتبار سے بھی ایسا بلند پایہ آدمی ہیں کہ مولانا فراہی جیسے لوگ بھی ان کی تقریروں کو یہ درجہ دیتے ہیں کہ ان کے نوٹ لیتے ہیں۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مولانا محمد علی کی تقریر میں وہ کیا چیز تھی جس سے استاذ مرحوم اس درجہ متاثر ہوئے... دوسری صبح کو جب مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ پر واپس آئے تو منتظمین میں سے بعض نے ان سے دبی زبان سے یہ شکایت کی کہ مولانا محمد علی کے ساتھ ان کے چلے جانے کے سبب سے خود مدرسہ کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ مولانا نے اس کا جواب یہ دیا کہ ''جو کام کی باتیں تھیں، وہ محمد علی نے اپنی تقریر میں کہہ دی تھیں، اس کے بعد کسی اور تقریر کی اب کیا ضرورت باقی رہی تھی۔''

مولانا نے یہ بات اس اعتماد اور یقین کے ساتھ فرمائی کہ ہر شخص پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مولانا کو مدرسہ کے جلسہ کے درہم برہم ہو جانے کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہے، ان کے نزدیک سننے کی باتیں وہی تھیں جو مولانا محمد علی نے کہہ دی تھیں اور لوگوں نے وہ سن لی تھیں، اس کے بعد جلسہ کا جاری رہنا ان کے نزدیک گویا اضاعت وقت کے حکم میں تھا۔ مولانا نے اس کے بعد متعدد بار مولانا محمد علی کی تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

''محمد علی کی تقریر میں ایمان ہوتا ہے۔''

ایک مرتبہ بطور لطیفہ کے یہ بھی فرمایا کہ:

''چونکہ محمد علی بہت ذہین آدمی ہیں اس وجہ سے لوگوں کو قرآن کے نظم کی طرح ان کی تقریروں اور تحریروں کے نظم کو سمجھنے میں بھی بسا اوقات زحمت پیش آتی ہے۔''

پھر فرمایا کہ:

''کچھ اسی قسم کا حال مولانا محمد علی قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں اور تحریروں کا بھی ہے۔''

(جولائی ۱۹۶۴ء)

[باقی]